اسلامی انقلاب کا اثر جاہلی معاشرے پر

(از جناب حبیب احمد صاحب)

کتنا عظیم الشان تھا وہ انقلاب، جو فتح مکہ کے بعد — پندرہ برس کے اندر اندر — تمام جزیرۃ العرب میں برپا ہو گیا، اس کی عظمت کو دیکھتے ہوئے اگر آپ یہ کہیں کہ اسے انقلاب سے بڑھ کے کوئی نام دینا چاہیے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ یہ ایک نئی تہذیب تھی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس مختصر زمانے میں عرب بُت پرستی سے نکل کر سلام کی طرف آئے اور ان کی قبائلی ناانصافی اور قومی نفرت ایک ایسی وحدت میں بدل گئی جو ہمہ گیر سیاست اور مشترک غرض کے بل پر قائم تھی۔ اس سے پہلے وہ جزیرہ نمائے عرب کی حدود میں سمٹے ہوئے تھے اور اس کے بعد یہ ایک ایسی وسیع سلطنت کے مالک بن گئے جس میں رومی اور ایرانی دونوں سلطنتیں تحلیل ہو گئی تھیں، پہلے ان کی اکثر بادیوں پر بدویت کی سختی و تنگ دستی چھائی ہوئی تھی اور اب وہ ایک ایسی آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگے جو اس سے پہلے ان کے لیے اجنبی تھی۔ ان حالات میں کوئی تعجب نہیں، اگر ان کی اجتماعی زندگی ان برق رفتار ریلیوں سے متاثر ہو جاتی اور زندگی اور مطالب زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بدل جاتا۔

اور یہ تھا بھی یہی وہ تمام محرکات جنھوں نے عربوں میں اس نئی تہذیب کو جنم دیا، ان کی انفرادی اور جماعتی دونوں زندگیوں پر اپنا اپنا اثر پہلے سے کسی حد تک رکھتے تھے۔ مذہبی محرک کا اپنا اثر، سیاسی محرک کا اپنا اثر اور اقتصادی محرک کا اپنا اثر۔ یہ اثرات بعض اوقات متناقض ہوتے تھے، لیکن وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہو کر آپس میں گھل مل گئے اور انہوں نے اجتماعی زندگی میں کچھ ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ اس کا جو اثر بعد کو اسلام اور مسلمانوں کی زندگی پر مترتب ہوا وہ نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتا اور دماغ کو اپنے متعلق سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس انقلاب کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ ہم عربوں کی اسلام سے پہلے

کی اجتماعی زندگی پر نظر ڈالیں۔ عربوں کی اکثریت صحرا میں زندگی بسر کرتی تھی۔ شہری آبادی بہت ہی کم تھی جس کا سبب یہ تھا کہ جزیرہ نمائے عرب میں باقاعدہ بہنے والی نہریں نہ تھیں اور نہ وہاں سال بہ سال وہ موسمی بارشیں ہوتی تھیں جو زمین کو سرسبز و زرخیز بناتی ہیں۔ چند علاقوں کو چھوڑ کے پورے جزیرۃ العرب میں کھیتی باڑی کا کوئی نظام نہ تھا، پھر شہر اور بستیاں ان مقامات پر آباد تھیں جہاں چشموں کی بہتات ہوتی تھی۔ باقی جو کچھ تھا، ریگستان ہی ریگستان تھا، جہاں بارشیں ہوتیں سبزہ اُگ آتا، ورنہ زمین بے آب و گیاہ رہتی۔ اس لیے یمن کے ریگزار بھی دوسرے ریگ زاروں کی طرح اہلِ یمن کے ایک بڑے حصے کو شامل تھے۔ البتہ نجد، حجاز اور عرب کے دوسرے تمام علاقوں میں شہری اور صحرائی آبادی کا جو تناسب تھا، اسی کے لحاظ سے یمن کی شہری آبادی اس کی صحرائی آبادی سے زیادہ تھی۔

ریگستان میں اجتماعی زندگی کی اساس قبیلہ تھا۔ قبیلہ خاندانوں سے ترکیب پاتا تھا، اور خاندان افراد کے نسبی اور قرابتی تعلقات سے وجود میں آتے تھے۔ خاندان کا ہر گھر نمدے کے خیمے میں رہتا تھا تاکہ جب کوئی قبیلہ اپنے اونٹوں کے لیے چراگاہ اور اپنے بال بچوں کے لیے رزق کی تلاش میں کوچ کرنا چاہے، تو اسے اٹھا کر لے جانے میں سہولت رہے۔ قبیلے اکثر گرمی اور بہار کے موسم میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے تھے جب ریگستان کے چھوٹے چھوٹے چشموں کے گرد گھاس کثرت سے اُگ آتی تھی لیکن موسمِ سرما کی آمد پر چراگاہیں خشک ہو جاتی تھیں تو یہ لوگ شہروں کا رُخ کرتے تھے اور ان کے قریب ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ پیٹ بھر روٹی حاصل کرنے کے لیے وہ اہلِ شہر کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے، یا ان پر چھاپے مارتے تھے، اس لیے کہ ان کی کفیل وہ آزادی تھی جو انہیں اچھے سے اچھے کھانے اور بہتر سے بہتر کپڑے سے زیادہ عزیز تھی۔

یہ ہے بدوی زندگی کے خاندانی اور گھریلو نظام کا مختصر سا خاکہ، جس میں بحیثیت مجموعی عرب کی شہری زندگی کے خاندانی اور گھریلو نظام کی تصویر بھی شامل ہے اس لیے کہ شہروں کے رہنے والے بھی بدویوں کی طرح قبیلوں ہی میں منقسم تھے اور ان میں سے اکثر بدوی الاصل تھے جن کے دلوں میں شہری زندگی کا شوق پیدا ہوا اور وہ شہروں میں آ کے رہ بس گئے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد شاید آپ آج بھی ان بدویوں میں جنہیں ہنوز تہذیب و تمدن کی ہوا نہیں لگی، اس نظام کے بچے کھچے آثار کا مشاہدہ کر سکتے ہیں اگرچہ اسلام نے

بہت کچھ اسے مٹا دیا تھا۔

عرب کے بدویوں اور شہریوں کا خاندانی اور گھریلو نظام آپس میں ملتا جلتا تھا لیکن زندگی کے سروسامان اور اس چیز میں، جسے آج ہم "اقتصادی نظام" سے موسوم کرتے ہیں، وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ اہلِ شہر اپنی زندگی تجارت اور اپنے ان باغوں، تاکستانوں اور کھیتوں کی پیداوار کے سہارے بسر کرتے تھے، جن میں بونے، جوتنے اور دیکھ بھال کے کام وہ کرایہ کے آدمیوں سے لیتے تھے۔ اور اپنی اس تجارت و زراعت سے انہیں بہت زیادہ آمدنی ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثر اپنا روپیہ سود پر چلاتے تھے، اور جو لوگ کاروبار وغیرہ کرنا چاہتے تھے، انہیں بھاری منافع پر قرض دے کر اپنی رقم تھوڑی سی مدت میں دوگنی کر لیتے تھے۔ یہ سب لوگ زندگی کی ان راحتوں اور آسائشوں میں کھیلتے تھے جن سے اہلِ بادیہ واقف بھی نہ تھے۔ شراب، موسیقی اور جوا ان کے لیے دن رات کا مشغلہ تھا اور خواہشوں کی شکم سیری نے زندگی کو ان کی نظر میں محبوب اور اطمینان افزا بنا دیا تھا۔ تجارت اور سود سے جو بے شمار نفع انہیں ہوتا تھا اس کی وجہ سے وہ لذتوں میں ڈوب گئے تھے اور بلند اخلاق کی بہت سی خوبیاں ان کی کتابِ زیست سے محو ہو گئی تھیں۔

لیکن خانہ بدوشی کی زندگی چراگاہوں کی تلاش اور اونٹ کے گوشت اور دودھ سے ترکیب پاتی تھی۔ ایک بدوی کی ملکیت نمدے کا ایک خیمہ ہوتا تھا جس میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ یا وہ غلہ اور پھل جو اپنے گرد و پیش کی زمین میں وہ بوتا تھا۔ کیونکہ قاعدہ یہ تھا کہ ملکیت اس کا ہے جو اسے بوئے۔ لیکن یہ ملکیت برائے نام ہوتی تھی۔ اس لیے کہ بدوی زراعت کو پسند نہ کرتے تھے اور کھیتی باڑی کو اپنے مرتبے سے کم تر سمجھتے تھے، لیکن قبیلے کی آبادی کے اردگرد جو چراگاہ ہوتی تھی وہ قبیلے کی مشترکہ ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ یہی حال اس گھاس کا تھا جو ریگستانی آبادی کی ان محفوظ چراگاہوں میں پیدا ہوتی تھی اور ہمسایہ قبائل کو یہ حق حاصل تھا کہ باہمی مفاد کے پیشِ نظر ایک قبیلہ اپنی زمین کا تبادلہ دوسرے قبیلے کی زمین سے کرے۔

قبائلی بستیوں کی حد بندی آپس کے اتفاق اور رواجی یکسانی سے ہوتی تھی۔ اور جب کوئی قبیلہ چراگاہ کی تلاش میں نکلتا تھا تو کسی دوسرے قبیلے کے لیے جائز نہ تھا کہ اس کی جگہ آباد ہو جائے یا اس کے رشتہ داروں اور ساتھیوں سے خون خرابہ کرے۔ لیکن اس قسم کی دراز دستیاں عام تھیں اور ان کے نتیجے میں قبائل کی باہمی پیکار

کوئی انوکھی بات نہ تھی اس لیے ایک بدوی پیدائشی طور پر شمشیر آزما اور قبائل کی زندگی اکثر اوقات مار دھاڑ اور چھینا جھپٹی کی زندگی ہوتی تھی۔

حملہ و انتقام کے خوف کا یہ فطری اثر تھا کہ وہ قبیلے کی یک جہتی میں اضافہ کر دیتا اور اس یک جہتی کی مزید تقویت کے لیے اس قبیلے کے افراد کو ماضی کی یادوں اور اپنے اسلاف کے جرات آموز اور شجاعت انگیز کارناموں کے طلسم زار میں پہنچا دیتا۔ اور یہی راز تھا عربوں کی اپنے نسب سے غیر معمولی دلچسپی کا کہ اس کے ذریعے وہ دوسروں پر اپنی برائی جتائیں، اپنی یک جہتی کو تقویت دیں اور اپنے اسلاف کی بلندیوں تک پہنچیں جو شجاعت، سخاوت، پناہ گیر کی حمایت اور اسی قسم کی ان دوسری خوبیوں کے لیے مشہور تھے، جن کا بیج بدوی زندگی نے ان کی فطرت میں بویا تھا اور جو ان کی سیرت و کردار کا ایک مستقل جزو تھیں۔ اور اخلاق کا یہ فرض تھا کہ ان خوبیوں سے اپنے اسلاف کی تقلید کریں کہ صرف انہی خوبیوں کے سہارے وہ بدوی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ایک بدوی ہمیشہ دوسروں کے حملے کی زد میں رہتا تھا اور بدویانہ زندگی عسرت و تنگ دستی کی زندگی تھی جو کبھی کبھی فاقہ کشی تک پہنچ جاتی تھی۔ اس لیے اگر اہلِ بادیہ شریف و سخی نہ ہوتے۔ مہمانوں کی مدارات اور پڑوسیوں کی حمایت نہ کر سکتے، تو ان میں سے اکثر ہلاک ہو جاتے۔ پھر صحرا کی زندگی خطرات پر غالب آنے اور حملہ آوروں کو شمشیر بشمشیر جواب دینے کی زندگی تھی، اس لیے اگر اہلِ صحرا بہادر، زیرک اور توانا نہ ہوتے تو زندگی کا بوجھ انہیں کچل ڈالتا۔ اور اگر ان میں مدافعت کی وہ صلاحیت نہ ہوتی، جو دوسروں کو ان سے خوفزدہ کر دیتی تو انہیں شر و فساد میں مبتلا ہو جانا پڑتا یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم و نثر کا بیشتر حصہ فخر و شجاعت اور سخاوت و مکارم کے ذکر پر مشتمل ہے اور ان میں ان مختلف فضیلتوں کا بیان پایا جاتا ہے جو خانہ بدوشی کی زندگی کا لازمہ تھیں، اور جو اہلِ صحرا کو اپنے اعادہ و تکرار پر مجبور کرتی تھیں۔ وہ صرف انہی لوگوں کے خلاف نہیں بھڑکتے تھے جو ان کی بستیوں پر حملہ آور ہوں بلکہ جان و مال، عزت و ناموس غرض یہ کہ ہر قدر کو ٹھیس لگنے پر بھڑک اٹھنا ان کا عام دستور تھا۔ قبیلہ اپنے ہر فرد کا انتقام لینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ جو لڑائیاں عزت اور ناموس کے انتقام میں شروع ہوتیں ان کی آگ برسوں تک سلگتی رہتی۔ اگر کوئی قبیلہ بطور خود انتقام لینے کے قابل نہ ہوتا تو وہ اپنے حلیف یا ہمسایہ قبائل سے درخواست کرتا کہ وہ اس کا ساتھ دیں۔ اس قسم کے

معاہدے عرب میں عام تھے اور ان معاہدوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ حلیف قبیلے مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اس وقت تک تلوار نیام میں نہ رکھیں گے جب تک مظلوم اپنا حق نہ پالے۔

ان کے ہر قبیلے بلکہ ہر گھر کا ایک الگ بت تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے لیکن بتوں کو پوجتے وقت وہ اللہ کے وجود سے انکار نہ کرتے تھے بلکہ انہیں اللہ کے ساتھ شریک کرتے اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ حج کعبہ کے وقت لبیک کہتے ہوئے اللہ کا نام لیتے اور ان بتوں کا اس کے شریک کی حیثیت سے ذکر کرتے تھے بعض قبائل کہتے: "حاضر ہوں! یا اللہ، میں حاضر ہوں! تیرا کوئی شریک نہیں، سوائے اس کے جو تیرا شریک ہے۔ تو اس کا اور دوسری چیزوں کا مالک ہے۔" قریش کعبے کا طواف کرتے اور کہتے: "قسم ہے لات و عزیٰ اور تیسرے منات کی۔ یہ اعلیٰ غرانیق ہیں اور ان کی شفاعت قابل اعتماد ہے۔" قرآن کہتا ہے وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ۔

یہ ہے اسلام سے پہلے عربوں کی اجتماعی زندگی کے عقائد و عادات کی اجمالی تصویر، جسے دیکھ کر آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام نے ان میں سے کن کن چیزوں کو مٹایا۔ فطری طور پر شرک ہی تھا جس کا اثر سب سے پہلے عربی ذہن سے محو ہوا۔ عربوں نے شرک کے متعلق وہ آیات سنیں جنہوں نے قبول اسلام کے بعد انہیں شرک کا سب سے بڑا دشمن بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جن لوگوں نے راہ ارتداد اختیار کی، یا نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا، انہوں نے بھی کسی کو اللہ کا شریک نہیں ٹھہرایا، بلکہ ہر جھوٹے نبی نے یہی اعلان کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کے نبی تھے اور وہ اپنی قوم کا نبی ہے۔ اور جب ارتداد کا خاتمہ ہو گیا تو سارا عرب لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ پر ایمان لے آیا۔

شرک کے اس خاتمے کا عربوں کے ذہن اور ان کی اجتماعی زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اب مسلمانوں کا خدا کے سوا کوئی آقا نہ تھا۔ بلکہ ان کی تمام تر عقیدت صرف اللہ جل شانہ کے لیے مخصوص ہو گئی تھی۔ اب کوئی مسلمان اپنی زندگی کے مسائل میں غیر خدا سے مدد کا طالب نہ ہوتا تھا۔ اب وہ خدا سے لو لگاتے تھے۔ اسی پر بھروسا کرتے تھے اور اسی سے مدد چاہتے تھے۔ اس سے عربی عقل اور عربی ضمیر پر بت پرستی کی جو بیڑیاں تھیں وہ کٹ گئیں اور یہ دونوں انسان کے لیے ترک و اختیار کی کسوٹی بن کے اس کے اور خدا کے درمیان

تنہا وسیلہ ہو گئے۔

عربی عقل بت پرستی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اللہ پر ایمان لے آئی، جو ہر چیز کا خالق ہے اور اسے وہم کی غلامی اور ان رسوم کی بندگی سے نجات مل گئی جو اس پر جاہلیت نے فرض کر رکھی تھیں۔ اللہ کی طرف سے آیا ہوا پیغام اب اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اور وہ اسے اپنانے کے لیے آمادہ تھی۔ عقل کی اس آزادی کا مذہبی زندگی کی طرح اجتماعی زندگی پر بھی بہت گہرا اثر پڑا۔

آبائی رسم و رواج کے خلاف یہ بغاوت واقعی اپنے اندر اتنی جان رکھتی تھی کہ عربی زندگی میں اساسی طور پر ایک ایسا اجتماعی انقلاب برپا کر دیتی جو بدویت اور مدنیت دونوں کو شامل ہوتا۔ یہ بغاوت وحی کے ذریعے آئی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی، اس لیے وہ اللہ کا ایک حکم تھی، جس سے بچنے کا کوئی رستہ نہ تھا اور جس کی تعمیل بہر صورت ہوتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی ذہن پر اس بغاوت کا اثر اس عقلی بغاوت کے اثر سے زیادہ شدید تھا جس نے بتوں کو ڈھا کر اور شرک سے انکار کر کے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ جب کبھی عقل و دل غلامی کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہوئے ہیں، آزادی کے نور سے ضیا اندوز ہونے کے لیے اسی کی طرف دوڑے ہیں۔ یہی حال ہماری فکر اور ہمارے ذاتی عقائد کا ہے۔ لیکن جہاں زندگی پر ہمارے اختیارات اور دوسروں سے ہمارے تعلقات کا سوال آتا ہے، اطاعت و تسلیم کی ڈوری میں تردد اور ہچکچاہٹ کی گرہیں پڑنے لگتی ہیں اور عقل کی سپر اندازی کے باوجود چاہتے ہم یہی ہیں کہ ہمارا اقتدار بہر صورت قائم رہے۔ اور جو کچھ اس میں کمی آگئی ہے، وہ کسی نہ کسی طرح پوری ہو جائے۔ اس لیے کہ ہماری خواہشوں کا تقاضا یہی ہے۔ عقل جتنی چاہے خواہشوں سے بلند ہو جائے اور آزادیٔ فکر جتنا چاہے بلند مقامات پر عبور حاصل کرے، انسان پر حکومت وہی جبلت کرتی ہے جو تمام خواہشوں کا مدار ہے۔

آج کل کی اصطلاح میں جسے "انسانی حقوق" سے موسوم کیا جاتا ہے، وہ دراصل مادی منفعتیں ہیں۔ انسانی فطرت مادی منفعتوں سے غیر معمولی تعلق رکھتی ہے اور باقی تمام چیزوں سے زیادہ ان سے چمٹی رہتی ہے۔

قرآن جو اقتصادی انقلاب لے کر آیا تھا۔ اس کا اثر اجتماعی انقلاب سے کچھ کم نہ تھا۔ دولت مند تاجر اور سردار وغیرہ جنھیں زمانۂ جاہلیت میں امتیازی مقام حاصل تھا، محتاجوں اور مزدوروں سے غرور و تکبر کے ساتھ پیش آتے تھے، اگرچہ یہ غرور و تکبر ان کی آزادی و خودداری کا گلا نہیں گھونٹ سکتا تھا اس لیے مالدار لوگ جب کسی محتاج کو کچھ دیتے تھے تو ترس کھا کے دیتے تھے اور پھر احسان جتا جتا کے اپنی عطا و بخشش کو مرتبے کی بلندی کا ذریعہ بناتے تھے۔

اسلام نے نزولِ وحی کے آغاز ہی میں انانیت کے اس جذبے کا مقابلہ کیا۔ لوگوں میں اخوت و مساوات کی بنیاد رکھی، مال داروں کو اس خیرات پر سرزنش کی جس کے نتیجے میں وہ احسان جتا جتا کے کچھ دیتے تھے اور محتاجوں کے لیے مالداروں پر زکوٰۃ فرض کی:

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (۲: ۲۶۳-۲۶۴)

ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔ اے ایمان والو، اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر خاک میں نہ ملاؤ۔

اور فرمایا:

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ

اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر حاجتمندوں کو دو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔

صدقہ مالداروں کا فقیر پر احسان نہیں، بلکہ فقیر کا مال دار کی دولت میں حق ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہیں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلوب مطلوب ہو، نیز گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹ : ۶۰)

ہیں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

اور فقیر کا یہ حق مساوی ہے والدین کے اس حق کے، جو ضرورت کے وقت انہیں اپنے بیٹے کے مال میں حاصل ہوتا ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲ : ۲۱۵)

لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتہ داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو۔ اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔

یہ ایک نئی تعبیر ہے جس کی اساس پر آپ بآسانی اسلامی نظامِ معیشت کی مکمل عمارت کھڑی کر سکتے ہیں پھر یہ ایک ایسی تعبیر ہے کہ اس قسم کی قوت سے عرب پہلے ناآشنا تھے۔ ہر زمانے میں لوگ احسان وعطا کے متعلق یہ کہتے رہے ہیں کہ وہ دینے والے کا کرم ہے۔ لینے والے کا حق نہیں۔ لیکن قرآن احسان وعطا کو ایک حق سمجھتا ہے اور صرف یہ حق ہی ہے جو مالدار کی دولت کو گناہ کی آمیزش سے پاک کرتا ہے، اسی لیے شروع شروع اس نغمے کے جان دار اثر نے اسلام کی اشاعت میں کام کیا اور بعد کو اسلامی جماعت میں وہ برق رفتار تبدیلیاں پیدا کیں جو اسی نظامِ معیشت کا لازمی ثمرہ تھیں۔

سود کے خلاف اسلام نے نہایت شدید جنگ کی، ارشادِ الٰہی ہے:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيْمٍ (۲ : ۲۷۶)

اللہ تعالیٰ سود کا مٹھ مارتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔

اور ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ إِلَّا

وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں ان کا حال اُس شخص کا سا

كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (۲: ۲۷۵) ہوتا ہے جیسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔

بلکہ قرآن نے سود کو لوگوں کے مال ناجائز طریقوں پر کھانے سے تعبیر کیا:

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۴: ۱۶۱)

اور وہ سود لیتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں سود کا جو رواج تھا اللہ نے اسے حرام قرار دے دیا اور تاکید فرما دی کہ جو شرائط پہلے طے پائی تھیں ان کے مطابق کوئی شخص ایک حبہ بھی وصول نہ کرے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲: ۲۷۸ و ۲۷۹)

اے ایمان والو خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی ہے، اُسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کر لو اور سود چھوڑ دو تو اصل لینے کے تم حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

اس اقتصادی و معاشی تنظیم کا اجتماعی زندگی پر اس قدر قوی اور گہرا اثر پڑا کہ سود خواری جاہلی معاشرے سے کلیتہً مٹ گئی جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی پرجوش تائید نے اپنے معاشرے میں کہیں بھی اور کسی زمانے میں بھی ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آخری زمانے تک مسلمان اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اس معاشی مفسدے سے نفرت کرتے چلے آئے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں کوئی نظیر اس قدر عظیم، مستحکم، ہمہ گیر اور پائندہ انقلاب کی نہیں ہے۔